

جائناں جائناں

احمد مندراز



www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں
تمام میری شکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ اُن زمانوں کی سہمتیں ہیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اُداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اُٹھیں گی یہ پسائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دکھ تھے یہ مانستا ہوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانستا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانستا ہوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخمِ گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ دردِ موجِ صبا ہوا ہے
یہ آگِ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھولِ یہ زخمِ سب ترے ہیں
یہ دُکھ کے فوجے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری حبِ دانی
میں کٹ گئے روز و شب تھے ہیں

وہ تیرا شاعر تراغزنی
وہ جس کی باتیں عجب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دنوں کا اُجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں بھت لیکن
کڑمی چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اُسی کے سینے میں گر چکا ہے



اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکانِ جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں تراپسیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی سوترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسرہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

—ق—

اول اول کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگ مینا سلگ اٹھی کہ رگ جاں جاناں

مذقوں سے یہی عالم نہ توقع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جُدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سبھی محفلِ یاراں جاناں
سر پہ زانو ہے کوئی سرِ بگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر پالکتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخل زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شاید ہی عزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنوان جاناں

ہم کہ روٹھی ہوئی رت کو بھی منالیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسم ہجراں جاناں

ہوش آیا تو بس بھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اڑتے ہوئے اور اقی پریشاں جاناں



اے خدا جو بھی مجھے پنڈ شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا ہے تو بیانی دے

جس کے ایسا پہ کیا ترکِ تعلق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنہ تنہائی دے

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے پھرے پر
یا مرے زخم کو بھریا مجھے گویائی دے

اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
پشیم گریاں نہ سہی پشیم تماشائی دے

جن کو پیرا، بن تو قیرو شرف بخشا ہے
وہ برہنہ ہیں انھیں خلعت رسوائی دے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فراز
وہ تو قاتل کو بھی الزام سیحانی دے



اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

دیکھنا سب رقصِ سہل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گرد دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محسوس کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہن
میرے لفظوں میں اتر کر میرا گھر دیکھے گا کون

ہم چراغ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدر اور سحر دیکھے گا کون

افصیل شہر سے دیکھیں فقیم شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرتا ہے فراز
شہرِ ناپرساں میں تیری چشمِ تر دیکھے گا کون

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں

خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ ہاں ہیں کہ جو

ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے

جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے

خواب مرتے نہیں

خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں

جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں

ظلم کے دوزخوں سے بھی ٹھکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے علم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی ٹھکتے نہیں

خواب تو حرف ہیں

خواب تو نور ہیں

خواب سقراط ہیں

خواب منصور ہیں

بین گراڈ

۱۹۷۶



یوں تو پہلے بھی ہوئے اُس سے کئی بار حُدا
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار حُدا

گر عنیم سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار حُدا

دو گھڑی اُس سے رہو دور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایہ دیوار سے دیوار حُدا

یہ حُدا کی گھڑی ہے کہ چھڑی ساون کی
”میں حُدا گر یہ کہناں، ابر حُدا، یار حُدا“

بجھکا ہوں سے کہے کون کہ اے بے خبر سر
ملوث گردن سے نہیں طرہ دستار جدا

اس قدر روپ ہیں یاروں کے، کہ خوف آتا ہے
سیر مہمانہ جدا اور سیر دربار جدا

کوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرہ دار و ساز
لیکن اس شخص کی سچ دھج بھتی سیر دار جدا

جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اس کے وعدہ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اس کی بات پہ کیوں غتب بار آئے گیا

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہوں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہ یار کا کیا ہے ہُوئی ہُوئی نہ ہُوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

بسبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بست
بس اک فراز تھا ظالم سے چُپ رہا نہ گیا



جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا
اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا

پھر بوجہ ہوں آج انہیں ساحلوں پہ پھول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

میت سوچو !

اور اس نے
مرے ساغر میں
مے سرخ انڈیلی — تو کہا
میت سوچو !

تم یہاں آتے ہو
اس ملک کے
اس شہر کے
اس جملہ تسکیں میں جہاں
سب کے سب رقص کناں

لغۂ بلب

مست ادا مت سوچو

جاگتی رات

کے چہرے پر ہے خوشبو کی ردا

مست سوچو

تم بھی کیا لوگ ہو

پر دیس بھی آتے ہو

تو لے آتے ہو

بیمار شب و روز و دل افکار

عزیزان وطن کی یادیں

اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح

جن کے دھبوں کو تو خود کار شینیں بھی نہیں دھو سکتی

یہ جو زنگار ہیں غربت کے

خود آزار جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں

انہیں سمجھوں لی ہیں

اس طرح بٹھالے ہوئے پھرتے ہو

کہ جیسے یہ تمہارے دل و جاں ہوں

اس گھڑی تم ہو جہاں

مملکت خواب نہیں

یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں

زندگی سے کی طرح

شوخی ہے طرّار نہیں

زہر آب نہیں

اپنے کشکول کو دہلیز پہ رکھ آؤ

کہ دریوزہ گری

اس جگہ تامل آداب نہیں

مست سوچو !

پیرس

۱۹۷۴



سنا تو ہے کہ نگار بہارِ راہ میں ہے
سفرِ بخیر کہ دشمن ہزارِ راہ میں ہے
گزر بھی جا غمِ جان و غمِ جہاں سے کہ یہ
وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمارِ راہ میں ہے
تمیزِ رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن
ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبارِ راہ میں ہے
گر وہ کجکھیاں کو کوئی خبر تو کرے
ابھی ہجومِ سرِ رہزارِ راہ میں ہے
نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظارِ راہ میں ہے
فراز اگرچہ کڑی ہے زمینِ آتش کی
”ہزارِ ما شجرِ سایہ دارِ راہ میں ہے“

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے
اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش ہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے
ہر گھر کا دیا گل نہ کرو تم کہ غبانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے
جو درپے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ ملامت نکل آئے
اے ہم نضو کچھ تو کو غمِ ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے
یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شائد کہ تمھارا قد و قامت نکل آئے

اب کس کا جشن مناتے ہو!

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کا گیت سناتے ہو
اُس تن من کا جو دو نیم ہوا

اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ
ان آنکھوں کی تفتیر ہوا
اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہوا

اُس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہوئی
اُس مٹی کا جس کی حرمت
منسوبِ عدو کے نام ہوئی

اُس جنگ کا جو تم ہمارے چکے
اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اُس زخم کا جو سیسنے پہ نہ تھا
اُس جان کا جو واری بھی نہیں

اُس خون کا جو بد قسمت تھا
راہوں میں بسایا تن میں رہا
اُس پھول کا جو بے قیمت تھا
آنگن میں کھلایا بن میں رہا

اُس مشرق کا جس کا تم نے
نیرے کی آنی مرہم سمجھا
اُس مغرب کا جس کو تم نے
جتنا بھی ٹوٹا کم سمجھا

اُن معصوموں کا جن کے لہو
سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا اُن مظلوموں کا جن سے
خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اُس مریم کا جس کی عفت
لُٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اُس عیسے کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غم خواروں میں

اُن نوحہ گردوں کا جن نے ہیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہوئے
ایسے جلاد بھی ہوتے ہیں

اُن بھوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقص سر بازار کریں
یا اُن ظالم قسّاقوں کا
جو بھیس بدل کر وار کریں

یا اُن جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفانہ ہوئے
یا اُن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دکھ کا نشانہ ہوئے

اُس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمہارے حصے میں
کیوں ننگ وطن کی بات کرو
کیا رکھا ہے اس قصے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لیے
اُس جشن میں ہیں بھی شامل ہوں
نوحوں سے بھرا کشکول لیے



ابر بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اُجاڑ اُجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خود کشی
جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

ہے دل کی موت عہد وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترک محبت کرے کرے

اب اپنا دل بھی شہرِ خموشاں سے کم نہیں
سُن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھڑ دھڑ

رہتے ہیں اہل شہر کے سائے سے دُور دُور
ہم آہو ان دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گل بن کے پھوٹتا ہے لہو شامخار سے
زخمِ رگِ ہسار ہیں پتے ہرے ہرے

زندہ دلاں شہر کو کیا ہو گیا فساد
آنکھیں بجھیں بجھیں ہیں تو چہرے مرے



شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
گلِ حباب ہیں سر میں ہوا بہار کی ہے

ہجومِ جلوۂ گل پر نغمہ نہ رکھ کہ یہاں
جراحاتوں کے چمن پر ردا بہار کی ہے

کوئی تو لالہ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصل چاکِ جگر کی ہے یا بہار کی ہے

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شمارِ زخم ابھی سے فہرستِ زکیا کرنا
ابھی تو جان مری ابتدا بہار کی ہے

دل گرفتہ ہی سہی بزمِ محبالی جائے
یا دُجاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنسیا دنہ ڈالی جائے

مصحفِ رُخ ہے کسی کا کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی خال نکالی جائے

وہ مروت سے بلا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فراز
کس طرح سے مری آشفۃ خیالی جائے



کہا تھا کس نے کہ عہدِ وفا کرو اس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے

نصیب پھر کوئی تقریبِ قرب ہو کہ نہ ہو
جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اس سے

یہ اہلِ بزمِ تنک حوصلہ سہی پسند بھی
ذرا فسانہ دل ابتدا کرو اس سے

یہ کیا کہ تم ہی عسیم بھر کے فسانے کہو
کبھی تو اس کے بہانے سنا کرو اس سے

فراز ترکِ تعلق تو خیر کیسا ہوگا!
یہی بہت ہے کہ کم کم ملا کرو اس سے



تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
پھر تو بھی در ملا ہے اُسی در کے ہو گئے

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی نا صحتِ انِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اُسی کافر کے ہو گئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کا ہسم
اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے

روستے ہوا گ جزیرۂ جاں کو سدا ز تم
دیکھو تو کہتے شہرِ سمندر کے ہو گئے



ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو اُلٹا کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آگئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدائے کونہ دی
اس توقع پر کہ شاید ٹوپلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہیں تھیں
تیرے ہاتھ پر کوئی میرا مقدر دیکھتا

زندگی بھیلی ہوتی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تو بھی دل کو اک لہو کی بوند سمجھا ہے فراز
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

سحر کے سُورج

سحر کے سُورج

میں رو رہا ہوں

کہ میرا مشرق لہو لہو ہے

وہ میرا مشرق

جو میرا بازو ہے میرا دل ہے مری نمو ہے

جو میرے اطراف کا نشان

میری آبرو ہے

لہو لہو ہے

سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں
کیا ہوا ہے
تجھے گمن ملک گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تری شعاعوں کا نور اندھیروں میں گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتہ رفاقت ہی کٹ گیا ہے

سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں
میں اسم تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں

یہ شیشہ سجاں کی کسچیاں
اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں

سحر کے سورج
ستم کی آندھی رُکے
تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا
سک سکوں گا
لہو کی بارش تھے
تو میں اس دُکھی بدن کو تھپک سکوں گا
ابھی تو میں جانکنی کے دُہرے عذاب میں ہوں
جو بکھ چکے وہ چراغ دیکھوں
کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں

سحر کے سورج

مری نظریں تو ان رفیقوں کے قافلے ہیں
جو گھر سے نکلے تھے سر اٹھائے قدم جمائے
جو منتظر تھے

کہ رزم گاہ طلب بلائے
جو آزمائش کی ہر گھڑی ہیں
یقین کی مشعلیں جلائے
وطن کی ناموس کے لیے
بے شمار بازو علم اٹھائے
رواں ہوئے تھے یہ عہد کر کے
کہ ان کی جانبیں رہیں کہ جائیں
مگر وفا پر نہ حرف آئے

سحر کے سورج

مری نظریں انہی رفیقوں کے قافلے ہیں

کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ
کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں
جو پاؤں بخیر
منفعل گر نہیں جھکائے
عدو کے زخموں میں
ان اندھیروں کی سرزمین کی طرف رواں ہیں
جہاں حقارت کے طعن
نفرت کے سنگ
رسوائیوں کے بازار
منتظر ہیں

سحر کے سورج
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تو نہ دیکھے
یہ جاں نثاروں شہید یاروں کا چمچاتا لہو نہ دیکھے
یہ میں نہ دیکھوں یہ تو نہ دیکھے



ستم گرمی کا ہر انداز محسوس نہ لگا
میں کیا کروں مراد دشمن مجھے بُرا نہ لگا

ہر اک کو زعم تھا کس کس کو نا خدا کہتے
بھلا چھو کہ سفینہ کنارے جا نہ لگا

مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو
کہ جس کو حال سنایا اُسے فسانہ لگا

بروین دور نہ کوئی روشنی نہ سایا تھا
بھی فساد مجھے اندرونِ حسانہ لگا

میں تھک گیا تھا بہت پے پے اُڑاؤں کے
جیسی تو دامن بھی اس بار آشیانہ لگا

سنگم کے عہد میں میں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت محسوس مانہ لگا

وہ لاکھ زود فراموش ہوشِ ساز مگر
اسے بھی مجھ کو بھلائے میں اک نمانہ لگا



آزردگانِ شہر کا جیسا بھی حال ہو
اے یارِ خوش دیار تجھے کیوں ملال ہو
اب بات دوستی کی نہیں جو صلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی سراہم خیال ہو
خود میرا ہاتھ جب مری بربادیوں میں تھا
تیری جہیں پہ کیوں عرقِ انفعال ہو
پھر تو نے چھوڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو
میری خسرتوں سے زیادہ کرم نہ کر
ایسا سلوک کر کہ مرے حسبِ حال ہو
ٹوٹا تو ہوں مگر ابھی بکھرا نہیں فساد
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو



برسوں کے بعد دیکھا » اک شخص دلربا سا
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا

اب روکھے کچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رُکی رُکی سی لہجہ تھکا تھکا سا

الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح رہتا سا

خوابوں میں خواب اُس کے یادوں میں یاد اُسکی
نیندوں میں گُل گیا ہو جیسے کہ رنج گاسا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا

اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

کچھ یہ کہ مدتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہریں بھجھا تھا اجاب کا دلا سا

پھر یوں ہوا کہ ساون آنکھوں میں آئے تھے
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی بھتا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یار و ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا

تیور تھے بے رخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگوں فراز کا